ترقی معکوس

بیاورید گر اینجا بود سخندانے

(حفیظ الرحمٰن، واصف)

چھوٹا بچہ جیسے پاؤں پاؤں چلنا سیکھتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس کی توانائی اور بڑھتی ہے۔ دوڑنا اور اچھلنا کودنا بھی سیکھتا ہے۔ اور شوق میں اپنی طاقت سے زیادہ بھی دوڑنا کودنا شروع کر دیتا ہے۔ اور بعض مرتبہ گر پڑتا ہے۔ چوٹ لگ جاتی ہے۔ رونے لگتا ہے اُدھر سے باپ جھٹ کر کہتا ہے وہ دیکھو کیسا بہادر ہے میرا چھلاوا۔ کیسا بہادری سے کودا ہے۔ اِدھر سے ماں یہ کہتی ہوئی دوڑ کر آتی ہے خوب کودا میرا لال۔ شاباش! اس کو اٹھاتی ہے اور گھٹنا دباتی ہے ہاتھ پکڑ کر اس کو کچھ دور چلاتی ہے اور کہتی ہے دیکھو کیسا ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے میرا لال۔

یہ ایک نفسیاتی اور نہایت موثر علاج ہے بچے کو درد کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ آنسو تھم جاتے ہیں۔ خوش ہو جاتا ہے اور بہل جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں پھر کھیلنے لگتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ گویا چوٹ اس کے لگی ہی نہیں۔ یہ ابتدائی مرحلہ تھا جو بطور علاج کے اختیار کیا گیا تھا۔

اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ بچہ خود ہی اس قسم کے الفاظ کہنے لگتا ہے۔ اگر کہیں چارپائی پر یا دوڑتے میں گر پڑا تو اپنی خفت مٹانے کے لیے جلدی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے۔ "دیکھو میں تیسا کودا" پھر ماں باپ اس کی تائید بھی کر دیتے ہیں۔ بڑا بہادر ہے میرا چھلاوا۔

اس طریقے سے اب وہ خود ان الفاظ کا عادی ہو جاتا ہے اور پھر جب آہستہ آہستہ معاملہ تلفظ سے آگے بڑھتا ہے تو الفاظ کے معانی کا ادراک بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ

اس کے اندر خود ستائی غرور اور اکڑ فوں کا جذبہ بھی پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اب گرنے کے بعد جب وہ اٹھتا ہے تو قصداً اکڑ اکڑ کے، اٹھلا اٹھلا کے، اترا اترا کے مٹک مٹک کے سینہ تان کر چلتا ہے گویا وہ اپنی بہادری کا اظہار کر رہا ہے۔ وہ ٹھمک ٹھمک کی منزل ختم ہو چکی۔

عام طور پر یہ عادت نادانی کی عمر تک رہتی ہے اس کے بعد جب شعور اور سمجھ پیدا ہو جاتی ہے تو یہ عادت ختم ہو جاتی ہے لیکن بعض افراد ایسے بھی ہیں کہ ان میں یہ عادت خواہ کسی دوسرے رنگ میں ہی سہی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ان کو اپنا ہر ایک کام خواہ وہ کیسا ہی بھونڈا ہو اپنی نظر میں اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور دوسروں کے سامنے وہ اس طریقے سے پیش کرتے پھرتے ہیں کہ گویا انھوں نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ کوئی مفید۔ کارآمد اور خوبصورت چیز ایجاد کی ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں۔ خود بھی تعریف و تحسین کے پل باندھتے ہیں اور دوسروں سے بھی داد چاہتے ہیں۔

بعض نوجوان شاعروں اور ادیبوں کا یہی حال ہے۔ شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا تو طبیعت کی روانی کو کیوں کر روکیں زبان کے لغات معلوم نہیں۔ محاورات کا استحضار نہیں۔ الفاظ کے مواقع استعمال کا صحیح علم نہیں۔ موزوں کہنے کی صلاحیت نہیں۔ کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا شان کے خلاف ہے۔ انھوں نے نئی نئی ترکیبیں ایجاد کرنی شروع کیں اور یہ ایجاد زیادہ تر بلا ارادہ ہوتی ہے۔ قوافی اور ردلیف کی پابندی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ وزن کو بھی نظر انداز کر دیا۔ نثر کے کچھ بے ربط جملے۔ کچھ الفاظ ملفوظات کی شکل میں لکھے اور اس کا نام ترقی پسند شاعری رکھ دیا۔ تعجب یہ ہے کہ ایک صفحے پر چند سطریں ہوتی ہیں۔ ایک سطر میں ایک لفظ۔ ایک سطر میں دو لفظ۔ ایک سطر میں ایک جملہ پھر ایک سطر میں ایک لفظ۔ پورے صفحے میں چار پانچ الفاظ ہیں۔ یہ آج کل کا فیشن ہے، جو ولایت سے درآمد کیا گیا ہے۔

اس قسم کا نوجوان کبھی کوئی غزل کہہ لیتا ہے۔ اور مشاعرے میں شریک ہوتا ہے تو غزل پڑھنے سے پہلے کہتا ہے کہ آپ حضرات میرے جذبات کو دیکھیے گا الفاظ کو نہ دیکھیے گا۔

آج کل کی ترقی پسند شاعری میں یا ملفوظات میں یا تو ایسی ہی عبارتیں ملتی ہیں جن کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا یا پھر انتہائی عریانی اور فحش گوئی۔

ترقی پسند ادب کی بنیاد تو در اصل بڑے نیک کردار علماء، فضلاء اور دانشوروں نے رکھی تھی۔ کہا یہ جاتا تھا کہ ہمارے اردو لٹریچر میں گل و بلبل۔ شراب وکباب عشق و محبت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ نہ اخلاقیات ہے نہ سیاسیات ہے نہ پند و نصیحت ہے۔

ایک حد تک یہ بات صحیح تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ہماری درسگاہوں میں ذریعۂ تعلیم اردو نہیں تھی۔ مغل بادشاہوں کے زمانے میں ذریعۂ تعلیم فارسی تھی اور سرکاری زبان بھی فارسی تھی بچوں کو اردو کوئی نہیں پڑھایا کرتا تھا۔ اور ہمارے بزرگ یہ کہا کرتے تھے کہ عربی فارسی پڑھنے کے بعد اردو کو نصاب کے طور پر پڑھنے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اصل مسئلہ رسم الخط کا تھا۔ رسم الخط آ گیا اردو بھی آ گئی۔ وہ تو مادری زبان ہے۔ درسیات میں فارسی کی جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں ان میں اخلاقیات۔ سیاسیات۔ منطق۔ فلسفہ۔ علم کلام۔ تصوف ہر قسم کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ شیخ سعدی کی کریما۔ گلستاں۔ بوستاں۔ پندنامۂ عطار۔ گلزار دبستاں۔ نام حق۔ انوار سہیلی۔ انشائے ابوالفضل۔ پنج رقعہ۔ وقائع نعمت خان عالی۔ اخلاق جلالی۔ اخلاق محسنی۔ سہ نثر ظہوری اور بہت سی اخلاقی اور سیاسی کتابیں ہمارے درس میں شامل تھیں۔

انگریزوں کے تسلط کے بعد انگریزی سرکاری زبان ہو گئی۔ اور اس کے بعد ابتدائی جماعتوں کا ذریعۂ تعلیم اردو وغیرہ قرار دیا گیا۔ سنسکرت۔ عربی اور فارسی کلاسیکل لینگویج کے طور پر باقی رکھی گئیں۔ ہمارے دانشوروں نے دیکھا کہ فارسی درسیات تو ختم ہو گئیں۔ اردو کورس اگر مرتب کیا جاتا ہے تو وہ کچھ اقتباسات و انتخابات ہوتے ہیں اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا لہٰذا اردو نظم کو اخلاقیات۔ اور سیاسیات جیسے مضامین کے لیے استعمال کیا

اس جدید اور مفید خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مولانا حالی۔ محمد حسین آزاد، سر سید

احمد خاں مولانا شبلی نعمانی - اکبر الہ آبادی - ڈپٹی نذیر احمد - مولانا راشد الخیری اور اس وقت کے دیگر اُدبا اور دانشوروں نے قدم بڑھایا - ان حضرات کا کلام (نظم و نثر) دیکھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کس قدر مفید - اصلاحی اور حکمت آمیز اقدام تھا - دراصل ترقی پسندی یہ تھی جو قوم کے لیے اخلاقی - معاشرتی اور سیاسی بیداری پیدا کرنے کا ذریعہ بنی - ان حضرات نے محض مضامین کا رُخ بدلا لیکن زبان - محاورات - لغات اور الفاظ کے مواقع استعمال پر یہ حضرات پورے حاوی تھے - اہل زبان تھے - عالم تھے - انھوں نے ایک روشن شاہراہ اور تابناک مستقبل کی طرف ادب و شاعری کا رُخ موڑا تھا -

آگے چل کر نوجوان طبقہ ترقی پسندی کا نام لے کر غلط راستے پر چلنے لگا - اس نے اپنی ناواقفیت تہی دامنی اور اناڑی پن سے زبان کو بھی بگاڑ کر رکھ دیا نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے محاورات ایجاد کرنے شروع کیے - اور اس بات کی پروا نہیں کی کہ زبان کے لحاظ سے الفاظ کے مواقع استعمال کیا ہیں - نئی ترکیب گرامر کے لحاظ سے معنی کے لحاظ سے صحیح ہے یا نہیں نیز غیر معتاد اور غیر مانوس تو نہیں ہے - بے سروپا زبان - محاورات اور مکروہ ترکیبیں ایجاد کرنے کے بعد بہت خوش ہوتے ہیں - اور اس کا نام ترقی پسند ادب رکھا جاتا ہے - یہ لفظ سُن کر عوام تو عوام خواص بھی مرعوب ہو جاتے ہیں - مہمل جملوں میں کوئی مضمون ڈھونڈھنے لگتے ہیں - جب نہیں ملتا تو بر کلے - شیکسپیئر اور یورپ کے دوسرے فلاسفروں کے فلسفے اس پر لادیتے ہیں - اور ردو دستی کا حق ادا کرتے ہیں - ترقی پسند ادب یا ترقی پسند شاعری "برعکس نہند نام زنگی کافور" کا مصداق ہے - زبان غلط محاورات غلط - لغات غلط - تشبیہات غلط - استعارات غلط غرضکہ اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں - اگر ہزل سرائی اور فحش گوئی کرنی ہے تو صحیح و فصیح زبان میں بھی کی جاسکتی ہے - اس شرمناک ادب کی بیسیوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں - اس وقت چند مثالیں پیش کرتا ہوں ملاحظہ ہوں -

"جو ہوا"

کھڑکی کھول کے چپکے سے باہر نکلی - گلی میں مجھ کو دیکھ کے گھبرائی بھاگی - میں نے دوڑ کے اس کا دامن تھام لیا - اس کی تلاشی لی - یہ اچھا کام کیا - پڑی ہوئی تھی اس کی جیب میں تڑی مڑی - اک نہائے جسم کی خوشبو بھینی سی (- آخری دن کی تلاش ص۹۵)

یہ چوٹّی ہوا ہے - کوئی معشوقہ نہیں - معلوم نہیں چپکے سے یہ کون سے مکان کی اور کونسی کھڑکی میں سے نکلی ہے - ہوا کی جیب بھی ہے - وہ کُرتا اور صدری بھی پہنتی ہے - اس کی تلاشی بھی لی جا سکتی ہے - خوشبو بھی ایسی چیز ہے جو توڑی مروڑی جا سکتی ہے - محاورہ بھینی بھینی تبکرار ہمیشہ سنتے رہے اب بھینی سی نیا محاورہ ایجاد ہوا ہے -

مذکورہ اشعار کے معانی شاید کسی فلاسفر کی بھی سمجھ میں نہ آئے ہوں گے - دیباچہ نگار نے ایک دوسری جگہ کے ملفوظ کو اس کے ساتھ جوڑ کر معنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے -

یہ خوبصورت مختصر نظم موجودہ مجموعہ میں بالکل یکہ وتنہا ہے - اب نظموں کا انداز یہ ہے "کالے پتھر کی خوشبو لال پھول میں در آئی ہے"

(آخری دن کی تلاش - ص۵۸)

خوشبو کا ذکر یہاں بھی ہے لیکن یہ خوشبو زندہ جوان حرارت سے بھرپور سڈول جسم کی نہیں - بلکہ موت کی بدقوارہ بڑھیا کی ہے جس کے جسم سے عود و عنبر و لوبان کی لپٹیں اٹھتی ہیں - لال پھول جس کالے پتھر کی مہک حملہ آور ہوئی ہے وہی نہایا ہوا بدن ہے جس کی خوشبو ہوا کی جیب میں تڑی مڑی پڑی ہوئی تھی -

اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد اور دو نظموں کو جوڑنے کے بعد اب کچھ سمجھ میں آیا کہ وہ چوٹّی ہوا کسی میت کے مکان کی کھڑکی میں سے نکلی ہے - غسل میت - کفن کی خوشبو یہ تو واضح ہوگیا - تلاشی لینے کا مطلب شاید یہ ہو کہ شاعر نے لوگوں سے پوچھا ہوگا کہ کون مرگیا ہے؟ ہم جیسے اناڑیوں کی فہم ناقص اس سے زیادہ نہیں پا سکی - کیا کوئی دانشور صاحب میری رہنمائی فرمائیں گے ؟ نیز کیا

شاعر بھی اسی پر راضی ہے کہ اس کے ایک ملفوظ صہ۴۵ کو ملفوظ صہ۵۵ کے ساتھ کھینچ کر جوڑا جائے اور زبردستی مطلب ٹھونسا جائے۔

ایسے استعارات جن سے ذہن مستعار منہ کی طرف منتقل نہو سکے۔ کذب یا غیر معنادی قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اس کو ترقی معکوس کہا جائے یا کچھ اور؟ زبان کی تراش خراش دیکھیے۔ طیارہ آسمان پر دوڑتا ہے۔ ریل زمین پر اڑتی ہے۔ محاورہ لپٹیں اٹھنا کی سند تلاش کیجیے اور بدوارہ کے کیا معنی ہیں۔ کون سے شہر یا کون سے طبقے میں یہ لفظ بولا جاتا ہے؟ کیا کالے پتھر میں بھی خوشبو ہوتی ہے؟ اور دیکھیے۔

نیند آئے تو

خوفناک جنگل میں جاؤں۔ سانپ مار کے کچا کھاؤں۔ ناچوں۔ گاؤں،
شور مچاؤں۔ ننگی کالی حبشن کو۔ آنکھ مار کے پاس بلاؤں۔ موٹے ہونٹوں
کا لمبا تگڑا بوسہ لوں۔ بڑے بڑے پستانوں پہ۔ سر رکھ کر گہری نیند میں
سو جاؤں۔ آنکھ کھلے تو حبشی کے نیزے کی نوک چھاتی میں چبھتی پاؤں۔
ننگی کالی حبشن کی۔ پھٹی پھٹی بھوکی آنکھوں میں ایک سے دو ہو جاؤں۔
(آخری دن کی تلاش صہ۳۱)

دیکھو میں تیسا تو دا۔ (مگر افسوس اندھے کنوئیں میں)

اس پر دیباچہ نگار نے جو ریمارک لکھا ہے ہم اس کو ترک کرتے ہیں۔ صرف آخری جملہ نقل کرتے ہیں۔

"انیسویں صدی سے بیسویں صدی تک ہم نے اتنی ترقی کی ہے"

یہ دیباچہ نگار نے شاعر کے ساتھ مذاق اور استہزا کیا ہے یا واقعی ان کی یہی رائے ہے کہ یہ ترقی ہے۔ ترقی کرنے والے چاند پر کمندیں ڈال رہے ہیں۔ ہماری ترقی پسندی کالی حبشن کی طویل وعریض پستانوں پر سر رکھے ہوئے سو رہی ہے۔ اور خواب میں بھی چھیچھڑے نظر آ رہے ہیں۔

ساری دنیا کے شاعر اپنے معشوق کو حسین ترین صورت میں دکھاتے ہیں۔ تفصیل اور امثلہ کی ضرورت نہیں سب جانتے ہیں۔ عربی کا ایک شاعر کہتا ہے:۔

فیھن صفراء المعاصم طفلۃ بیضاء مثل غریضۃ التفاح

ترجمہ۔ "ان قافلے والیوں میں ایک گوری گوری کلائیوں والی دوشیزہ ہے۔ سیب کی طرح سرخ و سفید"

اُردو کا شاعر کہتا ہے:

یاد ہے مجھکو تری طلعت موزوں کا نکھار ہائے وہ شوخ ادائیں وہ جوانی وہ ابھار
آنکھ وہ آنکھ فرشتوں کو کرے جو بیمار چال وہ چال قدم اٹھتے ہی آجائے بہار
ہے تمنا تری تعریف سناؤں تجھکو
تری ہنستی ہوئی تصویر دکھاؤں تجھکو (واصف)

مگر آج میلانِ طبع اور ذوق بدل چکا ہے۔ اس کو جدت طرازی کہا جاتا ہے اور فخر کیا جاتا ہے۔ اب غزل کی شان ملاحظہ ہو:

ان کو گناہ کرتے ہوئے میں نے جا لیا پھر ان کے ساتھ میں بھی گنہ گار ہو گیا

کیا ترقی یافتہ کردار یہی ہے۔؟

بیوی اکیلی ڈرتی ہے شام ہوئی اب گھر چلیے
علوی عادل اور سرشار تینوں کے تینوں اندر

تعمیر سے بلند ہے تخریب کا مقام اک سے ہزار ہو گیا آئینہ توڑ کر

آپ کا ایک معشوق ہے یا ہزار ہیں؟ اور اگر آپ کہیں کہ معرفت کا شعر ہے اور وہ ایک ہی ہر طرف نظر آتا ہے تو پہلے مصرع کا اس کے ساتھ کیا جوڑ ہے؟ اب غیر ترقی یافتہ شاعری ملاحظہ ہو۔

آہستہ برگ گل بفشاں بر مزار ما بس نازک است شیشۂ دل در کنار ما
(زیب النساء مخفی)

دلِ مایوس کو پامال کر کے چل دیئے، دیکھو — سنبھل کر پاؤں رکھنا آبگینہ تم نے توڑا ہے۔ (نامعلوم)

فرماتے ہیں:۔

مجھے بھی غزل خولیا ہو گیا — کئی دن سے میں بھی کھڑے پاؤں ہوں

کھڑے پاؤں ہوں کہاں کی زبان ہے۔؟

سڑک پر چلتے پھرتے دوڑتے لوگوں سے اکتا کر — کسی چھت پر مزے میں بیٹھے بندر دیکھ لیتا ہوں

شاید اولاد کی ترقی درجات پر مگن ہوں گے۔ دیباچہ نگار نے ادب کی روایات کے متعلق ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"یہ بے چارہ لفظ آج کل بہت سے تنقیدی بازیگروں کے ہاتھ میں ڈگڈگی کا کام دے رہا ہے۔"

اُن کے ہاتھ میں تو ادب کی روایات کی ڈگڈگی ہے۔ بندر نچانے کی ڈگڈگی کس کے ہاتھ میں ہے؟ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

آؤ ادب کے چوک میں کچھ مانگ کھائیں ہم — تم ڈگڈگی بجاؤ تو بندر نچائیں ہم

زبان کا جو حال ہے وہ بھی بہت افسوسناک ہے۔ بہت غیر فصیح الفاظ اس کتاب میں موجود ہیں۔ مثلاً اپنایئت۔ املا غلط ہے۔ اس میں "ی" یا ہمزہ دونوں میں سے ایک ہونا چاہیے۔ جیسے پنچایت۔ جھاکنا۔ اس میں نون غنہ ضروری ہے۔

"ابن مریم عجب لگ رہا تھا" "تو ممکن ہے میں بھول پاؤں"

"اندھیرا کھڑا تھا" (یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک بنگالی نے کہا تھا۔

"دوات طاق میں کھڑا ہے") "کوئی اپنا ہم شکل دکھتا نہیں ہے"

(دیہاتی زبان) "زمین کو سکوں دے نہ پائے تو کیا"۔ "تو کیا آج اس کے وہاں جائیں گے۔؟"

کیا اردوئے معلّٰی اسی کا نام ہے۔؟ اور کیا یہی وہ ادب ہے جو آئندہ نسلوں کے لیے آپ

چھوڑ کر جائیں گے ؟

خلیفہ مامون الرشید کے دربار میں ایک شاعر نے قصیدہ مدحیہ پڑھا۔ ایک شعر میں فنی غلطی تھی۔ مامون الرشید نے اس کو ٹوکا اور غلطی کی طرف توجہ دلائی۔ شاعر نے اپنی خفت مٹانے کے لیے قرآن مجید کی آیت وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي لَهٗ پڑھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اپنے پیغمبر کو شعر کہنا نہیں سکھایا۔ اور شعر گوئی پیغمبر کی شان کے لائق نہیں تھی" مامون الرشید نے فوراً جواب دیا کہ "او کمبخت تجھے معلوم نہیں کہ شعر سے ناواقف ہونا پیغمبر کے فضائل میں سے ہے اور تیرے لیے یہ نقائص میں سے ہے"

علماء نے تصریح کی ہے کہ شاعر نہ ہونا اور لکھنے پڑھنے سے واقف نہ ہونا پیغمبر کے فضائل میں سے ہے لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ غیر پیغمبر کے لیے نقائص میں سے ہے۔

حضرت مولانا اسعد اللہ ناظم مدرسہ سہارنپور بڑے اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے کسی شاعر نے ان کے سامنے اپنا شعر پڑھا۔ اس میں کوئی غلطی تھی جس پر انھوں نے ٹوکا۔ شاعر نے جواب دیا کہ ضرورتِ شعری کی وجہ سے ایسا کیا گیا ہے۔ مولانا نے فرمایا شعر کہنے ہی کی کیا ضرورت تھی۔

حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ نے ایک ایسے ہی موقع پر تحریر فرمایا تھا:

"آں حضورؐ نہ شاعر تھے نہ کبھی آپ نے شعر موزوں فرمایا۔ شاعر کا اس آیت سے استدلال کرنا غلط ہے۔ اعتراض یہ تھا کہ غلط شعر کیوں کہا۔؟ اس آیت سے اس کا جواب کہاں ہوا۔ آنحضورؐ نے اگر کبھی کوئی غلط شعر کہا ہوتا تو ایسے غلط گو شاعر اس کو سند بناتے لیکن حضورؐ انور نے تو کبھی شعر کہا ہی نہیں۔ آپ کے وصف سے استدلال کرنا ہے تو شعر کہنا چھوڑ دو۔ غلط شعر کہنا اور آنحضورؐ کی صفت (شاعر نہ ہونے) کو اپنی غلطی کے لیے عذر ٹھہرانا جہالت ہے" الخ

چند اور نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ اُن میں لغات، محاورات، تشبیہات، استعارات غور طلب ہیں۔ میں نے تھوڑے تھوڑے سے متفرق اقتباسات درج کیے ہیں:

آوازیں بے شکل ہواؤں میں جگمگا دڑ بن کر لٹک رہی ہیں۔ لیکن اپنے پاؤں، دریاؤں سے گھرے ہیں، صحراؤں سے چوڑے ہیں، کہساروں سے اونچے ہیں۔ (رسالہ شاعر بمبئی، جلد ۵۳ شمارہ نمبر ۹ ۱۹۸۲ء)

خدا جانے آپ کا قد کتنا اونچا ہوگا۔

چائے بیو ٹھنڈی ہو رہی ہے، سو تو پیوں گا مگر تم نے الجھاوے میں ڈال دیا۔ دیکھو اس طرح طنز یہ گفتگو نہ کرو اور سہل سیدھے انداز میں شروع ہو جائیے۔

دل کی گہرائی سے، ڈر کی مکڑی، نیچے گری۔

ہم تو سمجھتے تھے کہ ڈر کا ارنا بھینسا یا گینڈا ہوتا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ ڈر کی مکڑی ہوتی ہے۔

وقت کچکچاتا سمندر۔ علیل کاغذ کے آسمانوں میں، شبد کے بیج بو رہا ہوں۔ قلم کے نب سے، ٹپک رہا جامنی اندھیرا۔ تمہارے دل کی پرت ہوں لیکن، وصال کی انگلیوں نے اب تک پڑھا نہ مجھ کو۔

نابیناؤں کے لیے ابھرے ہوئے حرفوں کی تختیاں بنوائی جاتی ہیں۔ وہ انگلیوں ہی سے پڑھتے ہیں۔

(رسالہ شاعر بمبئی جلد ۵۳ شمارہ ۱۰ و ۱۱ ۱۹۸۲ء)

"میں مختصر ہو گیا"

میں نے دوڑ میں حصہ نہیں لیا، ایک ننھے بچے کو، گھوڑوں کی چال دکھاتا رہا شکست خوردہ گھوڑوں، برق رفتار خچروں کے درمیان، منّا بڑا ہو گیا، میں سر رہ گذر مختصر ہو گیا، منے سے زیادہ حیران اور مختصر۔

شاباش! کہاں نشو و نما پائی ہے کہ منّا بڑا بھی ہو گیا اور آپ منے سے زیادہ مختصر ہو گئے۔؟

اس نظم کا مفاد سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا یہ تیز بخار کا ہذیان تو نہیں ہے۔؟

قطب نما چوراہے پر ٹھٹھرا پڑا ہے۔

اوہ! کس قدر شدید سردی تھی کہ جمادات بھی ٹھٹھرنے لگے۔ اور قطب نما چوراہے پر کیوں کر

پہنچ گیا۔؟

"قربتیں بکھری ہوئی"

فضا کثیف، دہکتی ہر سو بے رنگ، آسمان پر بگلیوں کے ڈار اڑتے ہوئے، ہوا کے جسم پر سرطان کی پذیرائی، دھوپ کے بام پہ نابود ہو گئے چہرے، شام کی ٹہنیوں پہ کوئی برگ و بار نہیں، خواہشیں گرد سے ہوئیں مانوس، مہیب رات نے ساری بھی لے ڈوبی، قربتیں دھرتیوں پہ بکھری ہوتی، پھول کی سوکھی پتیاں صورت۔

(رسالہ شاعر بمبئی جلد ۵۴ شمارہ ۱ ۱۹۸۳ء)

یہ چینک کی بکواس تو نہیں ہے۔؟

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

شام کے وقت، نرم دھنک ریت پر۔ جذبہ کی گہری کھائی میں، میری لاش پہ تیرے بوسوں کی بوچھار میں جیسے ایک ننھا سا بچہ ہوں، اپنے اندر سے نکلا ہوں، خود سے باہر اپنا اندر کھوج رہا ہوں۔

(رسالہ شاعر بمبئی جلد ۵۴ شمارہ نمبر ۲ و ۳ فروری و مارچ ۱۹۸۳ء)

نرم دھنک، جذبہ کی گہرائی، اپنا اندر، یہ نوایجاد ترکیبیں سمجھ میں نہیں آئیں۔ کھوجنا، اردو میں مستعمل نہیں ہے۔ آپ خود ہی اپنی والدہ بھی ہیں، اب آپ کیا کھوج رہے ہیں۔؟

"سود و زیاں"

ایک پر ایک پانچ چھ اسٹول، اپنے کاندھے پہ گاڑھ کر بڑھتی۔ شہر بھر میں گھماتا پھرتا ہے، دل میں خوابوں کی چاندی لے کر، گلیوں گلیوں بھٹکتا رہتا ہے، ناامیدی کے تیز شعلوں میں، روز یہ کاروبار جاری ہے۔

(در رسالہ روشن ادب دہلی جلد ۴ شمارہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۱ء)

گاڑھ کر۔ کیا لفظ ہے؟ نظم کا حاصل کیا ہے۔؟

قمقموں کے برہنہ اجالوں کی رسوائی میں، ہانپتی کالی پکی پھسلتی سڑک
پر کھڑا حسرت ویاس سے تاڑ کے پیڑ کی وادیوں کی طرف تک رہا ہوں۔
جہاں، چمنیوں سے نکل کر فضاؤں کو دھندلا رہا ہے۔ ملوں کا دھواں۔

(رسالہ شاعر بمبئی۔ جلد ۵۳ شمارہ نمبر ۱۰ و ۱۱)

برہنہ اُجالے، اجالوں کی رسوائی، ہانپتی سڑک، یہ نو ایجاد تشبیہات و استعارات اور ترکیبیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ پوری نظم پڑھ کر بھی شاعر (بلکہ ماعر) کا ما فی الضمیر یا تخیل سمجھ میں نہیں آتا۔ مرزا غالب کے بارے میں کسی نے کہا تھا۔

کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے ۔۔۔ مگر اُن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ترقی یافتہ ماعروں کے لیے تھوڑا سا تصرف کر کے یوں پڑھیے:۔

کلام ذوق سمجھے اور کلام میرزا سمجھے ۔۔۔ مگر ان کا کہا یہ خود نہ سمجھیں بس خدا سمجھے

قدیم زمانے میں بھی ایسی مہمل شاعری تھی۔ مگر وہ محض مزاح و طنز کے لیے ہوتی تھی کسی نے مرزا غالب کے کلام پر طنز کے طور پر کہا تھا:۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مندرجہ بالا شعر طنز کے طور پر قصداً مہمل کہا گیا تھا۔ لیکن اگر شعر کہنے والا عصر جدید کے کسی ناقد محترم سے دوستی گانٹھ لیتا تو شعر با معنی اور بہت اعلیٰ پایہ کا ہو جاتا۔ دیکھیے اس طرح:۔ وہ بھینس سے مراد رات ہے۔ اور سورج اس کا انڈا ہے۔ گلاب میں اور تمام پھولوں میں سورج ہی کی روشنی سے رنگ پیدا ہوتے ہیں۔ تمام جڑی بوٹیاں اور نباتات سورج ہی سے پکتے" اور تیار ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ روغن گل اور تمام دواؤں کا منبع و ماخذ وہی بھینس کا انڈا ہے" (ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی؟)

بلبل کی انگلیوں میں رگ گل کی پھانس ہے
مصرع تو کچھ نہیں ہے فقط ٹھونس ٹھانس ہے

بہت بڑے انبار میں سے بطور نمونہ مشتے از خروارے درج کیا گیا ہے۔ خدا جانے ہمارا ادب کس طرف جا رہا ہے۔ اس موقع پر رضا نقوی واہی کی نظم پڑھ کر لطف اٹھائیے:۔

نیم وحشی شاعری کا انجام

(از رضا نقوی واہی)

دو کروڑ اکسٹھ ہزار اہلِ سخن کا وہ کلام
عرصۂ بن باس میں لکھا گیا جو صبح و شام

فی سخنور اک غزل ہر روز لکھنے کا عمل
دس برس تک رات دن چلتا رہا تھا بے خلل

اب جو یہ اشعار آئے ارضِ شعرستان سے
اول اول خوش ہوئے نقادجی سے جان سے

لیکن ان اشعار کے اسٹور کرنے کا سوال
منصرم حضرات کی نظروں میں تھا کارِ محال

خیر سے خالی ملے سرکاری غلے کے گدام
آخرش رکھا گیا اُن میں یہ لاکھوں ٹن کلام

پھر کبوتر خانۂ اشعار نجوایا گیا
شاعری کی مختلف صنفوں کو کھتیایا گیا

یوں تو ہر صنفِ سخن کا تھا نمونہ دستیاب
"نیم وحشی شاعری" لیکن تھی بے حد و حساب

انسپکشن جب کلیم الدین احمد نے کیا
دیکھ کر غزلوں کا انبار ان کا سر چکرا گیا

غیظ میں آکے یہ حکمِ خاص جاری کر دیا
جس نے جیناہی غزل سازوں کا بھاری کر دیا

دس برس تک مارشل لا کا نفاذ عام ہو
مثلِ نسبندی غزل گوئی کا چکا جام ہو

بلکہ اب تک آ چکا اسمگل ہو کر جو کلام
اس کی بو بھی سونگھنے پائیں نہ ناقد یا عوام

جابر و مجبور یعنی ناقد و اہلِ سخن
اس نئے فرمان کے پنجے میں آئے دفعۃً

ناقدوں کے دل میں اٹھی تھی جو تنقیدی ترنگ
ایک ہی ضربِ کلیمی سے کٹی مثلِ پتنگ

شاعروں کو مل رہا تھا شعر کے بدلے اناج
ہو گیا اس حکم سے مفلوج ان کا کام کاج

بند پنجروں میں پھنسے بے آب و دانہ ہو گئے
دیکھتے ہی دیکھتے سب بے ٹھکانہ ہو گئے

ناقدوں نے شوق کو اپنے پہنائیں بیڑیاں اور پھر کر لی سبھوں نے پان بیڑی کی دکاں

شعر توردی کی در پہ بیوپاری لے گئے

شاعروں کو باندھ کر نٹ اور مداری لے گئے

اس موقعہ پر ایک لطیفہ ہوا۔ مذکورۂ بالا نظم راقم الحروف کے فرزند ارجمند مولوی انیس الرحمان سلمہٗ بلند آواز سے پڑھ رہے تھے۔ ان کے بہن بھائی اور گھر کے سب افراد بیٹھے ہوئے سُن رہے تھے۔ اُن کا بچہ (عمر تین سال) پاس ہی کھیل رہا تھا۔ جب نظم کا آخری شعر پڑھا تو بچہ فوراً بولا کون لے گئے ؟ (کیوں لے گئے ؟) سب ہنس پڑے اور بچہ مسلسل پوچھ رہا تھا "کون لے گئے ؟" جب کسی نے جواب نہ دیا تو میری طرف مخاطب ہوا۔ "دادا جان! کون لے گئے ؟ مجھے بھی سوچنا پڑا۔ سوچ کر میں نے جواب دیا۔ "یہ لوگ بیکار پھرنے لگے تھے، ان کو کام دھندے سے لگانے کے لیے مداری لے گئے۔" وہ اچھا کہہ کر پھر کھیلنے لگا۔

پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم نے قدیم شعراء کی غزل گوئی کو "نیم وحشی شاعری" کا خطاب دیا تھا۔ رضا نقوی نے غالباً انھیں کی ترجمانی اور تائید میں مندرجۂ بالا نظم کہی ہے۔ نیاز سلطان پوری نے اپنے مقالہ میں پروفیسر مرحوم کی کسی تحریر کا اقتباس دیا ہے:

"میر، سودا، درد، غالب، مومن کی غزلوں سے یہ حقیقت عیاں ہے کہ ان میں اعلا پایہ کے شاعر ہونے کی صلاحیت موجود تھی۔ اگر وہ کسی مغربی ادب سے واقف ہوتے، نظم کے مفہوم سے آشنا ہوتے تو آج اردو شاعری، دنیائے ادب میں اس قدر پست اور مبتذل نظر نہ آتی۔ (اخبار قومی آواز لکھنؤ۔ یکم جنوری ۱۹۸۲ء)

راقم الحروف یہ فیصلہ قارئین پر چھوڑتا ہے کہ رضا نقوی کی نظم قدیم شاعری پر چسپاں ہوتی ہے یا موجودہ ترقی پسندانہ شاعری پر ؟ نیم وحشی شاعری اگر میر، سودا، درد، غالب، مومن کی شاعری ہے تو جو نمونے ترقی پسند ادب کے ہم نے اوپر درج کیے ہیں اس کو وحشی شاعری کہا جائے یا کچھ اور ؟

متقدمین کے کلام کی وجہ سے تو اردو ادب پست اور مبتذل قرار دیا گیا، اور موجودہ ترقی یافتہ ادب سے فصاحت و بلاغت کے دریا بہہ رہے ہیں اور تخیل کی لطافت و نفاست کے چشمے ابل رہے ہیں۔ آفریں اس انداز فکر پہ۔

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم

اردو رسم الخط کا مستقبل

آج کل کے اخبارات سے اور نا اہل لوگوں کے مرتب کیے ہوئے کورس کی کتابوں سے اور کم علم مترجموں کے ہاتھوں اردو زبان کی جو بربادی ہو رہی ہے وہ بجائے خود افسوسناک ہے لیکن اس سے زیادہ افسوسناک اور تاریک اردو رسم الخط کا مستقبل ہے۔

اردو رسم الخط جس کو نستعلیق کہا جاتا ہے ڈیزائنروں اور مصوروں کے ہاتھوں نہایت کس مپرسی کے عالم میں ہے۔ آج کل ایک فیشن چل پڑا ہے کہ کتاب کا سرورق بگڑے ہوئے خط میں لکھا جاتا ہے۔ کتاب کا نام، مصنف کا نام ڈسٹ کور کے اوپر نہایت بدخط لکھا ہوا ہوتا ہے مصور اور ڈیزائنر ڈیزائن کے ساتھ ساتھ کتاب کے نام کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور جیسا ان کو لکھنا آتا ہے ویسا ہی لکھتے ہیں۔ کچھ ٹیڑھی سیدھی نوک پلک نکال کے اس کو خوبصورت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ فیشن جو چل پڑا ہے اور یہ نیا خط جو ایجاد کیا گیا ہے اس کے کوئی قواعد و ضوابط مقرر نہیں کیے گئے۔ نہ کسی ایک شخص نے اس کو ایجاد کیا ہے نہ اس کی کوئی شکل متعین کی گئی ہے۔ آپ کسی کتب خانے میں چلے جائیے اور کتابیں اٹھا اٹھا کر دیکھتے رہیے۔ ہر ایک ڈسٹ کور کے اوپر نیا انداز تحریر دکھائی دے گا۔ شاید ہی کوئی مصور اور ڈیزائنر ایسا ہو جس نے خوش خطی کی مشق کی ہو جتنے ڈیزائنر ہیں اتنے ہی انداز تحریر ہیں۔ ہر ایک کتاب پہ نیا ہی انداز تحریر ملے گا۔ کہیں رسی کی شکل میں حرف لکھے ہوئے ہوتے ہیں۔ کہیں نقطوں کے ستارے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور حرفوں کی غلط سلط نوکیں نکلی ہوئی ہوتی ہیں۔ کہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوات میں مکھی ڈوب گئی تھی اس کو نکال کر کاغذ پر رکھ دیا ہے اس نے کاغذ پر رینگ کر حرف بنا دیے ہیں۔ کہیں معلوم ہوتا ہے کہ تنکے سے

لکھا گیا ہے کہیں معلوم ہوتا ہے سُرمے کی سلائی سے لکھا گیا ہے۔ کہیں نقطے نوکدار قطرے کی شکل کے ہوتے ہیں۔ غرضکہ خط کا یہ تنوع دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس جدید خط کا کوئی خاص نام بھی نہیں ہے۔

نسخ و نستعلیق کے ضابطے مقرر ہیں۔ ہر ایک جوڑ کی پیمائش مقرر ہے۔ سالہا سال محنت کرنے کے بعد اس میں مہارت پیدا کی جاتی ہے۔ قلم بنانے کا طریقہ۔ قط رکھنے کا طریقہ۔ سیاہی کو قالو میں رکھنے کا طریقہ۔ نوک پلک وغیرہ کے قاعدے، سب مقرر و متعین ہیں۔ مصور اور ڈیزائنر اور سکیچر نسخ و نستعلیق کی مشق نہیں کرتے نہ سیکھتے ہیں۔ جیسا ان کا خط ہے ویسا ہی لکھ دیتے ہیں۔ رنگ آمیزی کر کے ڈیزائن میں شامل کر دیتے ہیں۔ اگر ایک ہزار مصور اور ڈیزائنر ہیں تو خط کے اسٹائل بھی ایک ہزار ہی ہوں گے۔

یہ فیشن شروع تو کیا تھا خط اناڑیوں نے "دیکھو میں تیسا تو دا" کی عادت کے مطابق۔ مگر افسوس کہ اعلیٰ درجہ کے خوشنویسوں اور اساتذہ نے بھی اس کو بڑی فراخ دلی سے اختیار کر لیا ہے اور اپنی مہارت فن کو اس گھناؤنے فیشن پر قربان کر دیا ہے۔ اس کو اُردو کی بدنصیبی و مظلومیت کہا جائے یا اپنی غلامانہ ذہنیت؟

یہ ایک بڑا زبردست حادثہ ہے جو اُردو کے حسین رسم الخط کو فنا کر رہا ہے۔ جو مصنفین اپنی کتاب کے ڈسٹ کور پر اس بگڑے ہوئے یا لقوہ زدہ خط کو برداشت کرتے ہیں بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ میں اُن سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی ساری کتاب کو اُسی خط میں کیوں نہیں لکھواتے؟ یہ غفلت اور بے پروائی خود مصنفوں اور ناشروں کی ہے۔

گر ہمیں مکتب است و ایں ملا کار طفلاں تمام خواہد شد

کہا جاتا ہے کہ خط نستعلیق دنیا کا بہترین خط ہے۔ اس میں جو حُسن۔ جو نزاکتیں۔ جو نوک پلک جو پیوند کا تناسب موجود ہے وہ دنیا کے کسی خط میں نہیں۔ لیکن افسوس ان ڈیزائنروں نے اس کی وہ مٹی پلید کی ہے کہ اس کو دیکھ کر گھن آتی ہے۔

اُردو زبان اپنے رسم الخط کے ساتھ زندہ رہ سکتی ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ رسم الخط گیا تو زبان بھی گئی۔ زبان گئی تو رسم الخط بھی گیا۔ مصوروں کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ کچھ آڑی ترچھی الٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر بتاتے ہیں کہ اس میں بسم اللہ نظر آتی ہے۔ اس میں کلمہ نظر آتا ہے۔ وغیرہ۔ مگر درحقیقت "دیکھو میں تیسا تو دا" کے سوا کچھ بھی نہیں۔

اس موقع پر جعفری صاحب کی ایک نظم کے کچھ چیدہ اشعار پیش کرتا ہوں:

ایبسٹریکٹ آرٹ

ایبسٹریکٹ آرٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے
کی تھی ازراہ مروّت ہی ستائش میں نے

آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا تو شرماتا ہوں

ایک تصویر کو دیکھا جو کمالِ فن تھی
بھینس کے جسم پہ اک اونٹ کی سی گردن تھی

ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں
ٹانگ کھینچی تھی کہ مسواک جسے کہتے ہیں

نقش محبوب مصور نے سجا رکھا تھا
مجھ سے پوچھو تو تپائی پہ گھڑا رکھا تھا

بولی تصویر جو میں نے اسے اُلٹا پلٹا
"میں وہ جامہ کہ جس کا نہیں الٹا سیدھا"

ایک تصویر کو دیکھا کہ یہ کیا رکھا ہے
ورق صاف پہ رنگوں کو گرا رکھا ہے

ٹیڑھی ترچھی سی لکیریں تھیں وہاں جلوہ فگن
جیسے ٹوٹے ہوئے آئینہ پہ سورج کی کرن

تھا کیوبزم میں کاغذ پہ جو آتا تھا نظر
مجھ کو اینٹیں نظر آتی تھیں اسے حسن بشر

ایک تصویر جو دیکھی تو یہ صورت نکلی
جس کو سمجھا تھا اناناس وہ عورت نکلی

اس نمائش میں جو اطفال چلے آتے تھے
ڈر کے ماؤں کے کلیجوں سے لپٹ جاتے تھے

میں نے یہ کام کیا سخت سزا پانے کا
یہ نمائش نہ تھی اک خواب تھا دیوانے کا

(متاعِ سخن)

ایک بڑھئی سے کواڑوں کی جوڑی بنوائی۔ اس نے جو گھٹیا سا ہنا کر ویسے ہی سیدھے سپاٹ دِلے ٹھونک ٹھانک کر تیار کر دی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ کیسی جوڑی بنائی۔ نہ تو دِلوں میں لوزات وغیرہ

بنائی۔ نہ ز کوٹوں اور گنجکوں میں گولا غلطاں؟ کچھ نہیں بنایا۔ کہنے لگا آج کل کا فیشن یہی ہے اب تو ویسا کوئی نہیں بنواتا۔ میں نے کہا یہ فیشن کس نے ایجاد کیا ہے؟ تو آئیں بائیں شائیں ہانکنے لگا۔

بات دراصل یہ ہے کہ آج کل کام کرنے والے خود بخود فیشن ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ اپنی تن آسانی اور بدنیتی کی وجہ سے چاہتے یہ ہیں کہ تھوڑے سے وقت میں زیادہ سے زیادہ پیسے کمائیں۔ اس لیے دقیع الوقتی کرتے اور کام کو گھسیٹتے ہیں۔ یہ کہہ دیتے ہیں کہ آج کل کا فیشن یہی ہے۔ سننے والے اس لفظ سے مرعوب ہو جاتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ چلتے ہوئے فیشن کے خلاف لب کشائی کی جائے تو قدامت پسندی کا الزام لگتا ہے۔ اور وہمی کا خطاب ملتا ہے۔ اس لیے خاموش ہو جاتے ہیں۔

ایسا ہی حال کاتبوں کا ہے۔ اول تو کاتبوں کی کمی پریشان کن ہو گئی ہے۔ اور ہیں تو ایسے ہیں کہ صرف مفردات کی تختی نکالی ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ مشق کی اور اجرت کا کام کرنا شروع کر دیا۔ نہ حرفوں کی صحیح شکل لکھ سکتے ہیں نہ جوڑ پیوند کا ان کو علم ہے۔ غلط جوڑ، غلط شوشے، بلا ضرورت کششوں کی بھرمار، عبارت کو بکھرا ہوا لکھنا ایک عام عادت ہو گئی ہے۔ حالانکہ اساتذۂ فن نے کتابت میں بلا ضرورت کشش کے استعمال کو عیب قرار دیا ہے۔

ایک نوجوان کاتب صاحب کو میں نے لکھنے کے لیے ایک کتاب دی۔ انھوں نے اصل کتاب کے دو صفحوں کو چار صفحوں میں لکھا۔ اور جب میں نے ان سے کہا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ تو فرمایا کہ آج کل کا تو یہی فیشن ہے۔ ایسا ہی کھلا کھلا لکھواتے ہیں۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ فیشن بنانے والے بھی تم ہو۔ تمہاری لکھائی میں گٹھاؤ نہیں ہے۔ اس طریقے سے میری کتاب دو سو صفحے کے بجائے چار سو صفحے کی ہو جائے گی۔ اپنے پھوہڑپن اور نقص اور خود غرضی کو فیشن قرار دیتے ہو اور گاہکوں کی طرف منسوب کرتے ہو اور کہتے ہو کہ وہ ایسا ہی پسند کرتے ہیں۔ اگر بچّوں کے کورس کی کتابیں کھلی کھلی لکھی جائیں تو ٹھیک ہے لیکن غیر درسی اور علمی و فنی کتابوں کو اس طرح سے لکھنا حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

غرض یہ ہے کہ اردو کی نیا ڈانوا ڈول ہے۔ اردو کے مخالفین کا کیا گلہ شکوہ کیا جائے۔ آج کل کے اردو اخبارات و رسائل نے تو زبان کا حلیہ بگاڑ دیا ہے اور ڈیزائنروں اور نا اہل کاتبوں نے

اور دو رسم الخط پر کلہاڑا چلایا ہے۔ اس خوبصورت نستعلیق خط کو بگاڑنا، بد نما کرنا اور اس کا نام فیشن رکھدینا، کیا ترقی اسی کو کہتے ہیں؟ اور یہ ترقی حسن و جمال کی طرف ہے یا بدنمائی و قبح اور بگاڑ کی طرف؟ کیا یہی وہ رسم الخط ہے جس کی بقا کی کوشش کی جارہی ہے؟

اُردو رسم الخط لکھنے کے لیے تھوڑی سی فارسی و عربی کی واقفیت ضروری ہے کیونکہ اُردو میں فارسی ترکیبیں بہت استعمال ہوتی ہیں۔ عربی کے الفاظ اور عربی کا الف لام بھی بہت زیادہ استعمال میں آتا ہے۔ الفاظ کی ساخت کا بھی جاننا ضروری ہے۔ مثلاً عزیز ایک لفظ ہے۔ ایک سطر میں "عز" اور دوسری سطر میں "یز" لکھدے تو معلوم ہوگا کہ کاتب بالکل جاہل ہے۔ آج کل کے کاتب اس قسم کی بہت غلطیاں کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو زبان اور اردو رسم الخط تو فنا ہوتا جارہا ہے اور ہمارے دانشور اور ادیب بڑے بڑے لمبے چوڑے فلسفیانہ تبصرے، تقریظیں، دیباچے، پیش لفظ اور تاریخی مقالے لکھنے میں مصروف ہیں۔ جن میں یا تو عربی فارسی کے بہت بھاری بھاری اور ثقیل الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں یا خود ساختہ اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں جن کا زبان کے لغات و محاورات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ اور ہمارے لیڈر اردو کا حق منوانے کے لیے بڑی بڑی کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں۔ صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ زبان اور رسم الخط ہے کہاں جس کے لیے اتنی ہنگامہ آرائی کی جاتی ہے۔ کیا اس کی حفاظت کی طرف توجہ کی گئی ہے؟

قوم کا مستقبل

یہ ننھے ننھے مُنّے بچے جو نرسری اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں، قوم انھیں کا نام ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت اگر صحیح طریقے سے نہ ہو سکی تو بڑے ہو کر بھی درست نہ ہو سکیں گے۔ ایک فارسی شاعر کہتا ہے:

خشت اوّل چوں نہد معمار کج ‏ ‏ ‏ تا ثریا می رود دیوار کج

یعنی معمار جب پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھتا ہے تو دیوار ثریا تک ٹیڑھی ہی جاتی ہے جو عادت

بچپن میں پڑ جاتی ہے وہ عمر بھر قائم رہتی ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ابتدائی تعلیم کے لیے بہترین قابل، تربیت یافتہ، مہذب، بلند کردار افراد چھانٹ کر رکھے جاتے لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ میری ایک تجویز ہے۔ اگرچہ یہ جانتا ہوں کہ ہمارے ملک کا آج کل فیشن یہ ہے کہ تجویزیں بہت بنتی رہتی ہیں لیکن وہ کاغذ تک محدود رہتی ہیں۔ میری تجویز کا حشر بھی یہی ہوگا۔ یہ جانتے ہوئے بھی تجویز پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔

"ایں ہم بر سر علم" وہ یہ کہ ریڈروں اور پروفیسروں کو نرسری اسکولوں میں لگایا جائے اور پرائمری کے جو معلم بدخط، بدلسان، بدسلیقہ ہوں ان کو غالب اکادمی میں خوش خطی سیکھنے کے لیے خلیق ٹونکی کے سپرد کر دیا جائے۔ اور خلیق ٹونکی پر پابندی لگا دی جائے کہ وہ صرف نسخ و نستعلیق سکھائیں۔ ڈیزائن سازی، نقش و نگار، خط کوفی، خط رعنا، خط نازنین اور خط آرٹنگ برٹنگ وغیرہ سکھانے کی ضرورت نہیں۔

تنخواہیں ریڈروں اور پروفیسروں کی بدستور قائم رکھی جائیں اور پرائمری کے معلموں کو بھی کم از کم تین سال بدستور تنخواہیں دی جائیں۔ تین سال کے بعد خوش نویسی میں اپنی موجودہ تنخواہوں سے بہت زیادہ کمانے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس وقت اردو کے کاتبوں کی بہت کمی ہے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا تو قوم کا مستقبل ہمارے سامنے ہے۔ جس دور سے ہم گذر رہے یہ مستقبل ہی تو ہے۔ اور آگے کا مستقبل اس سے زیادہ عبرتناک دکھائی دیتا ہے۔

یہ جو کچھ بھی اظہار جذبات ہے   مرے درد دل کی حکایات ہے
حد ادب کو ملحوظ رکھ کر   مری بات سمجھو تو کیا بات ہے

حفیظ الرحمان واصف

۸ جنوری ۱۹۸۴ء